Open Access
Al Khadim Research Journal
Islamic Culture and Civilization
ISSN (ONLINE): 2710-0235
ISSN (PRINT): 2710-0227

ARJICC, Vol: 7, Issue: 1,
January to March 2026
DOI: 10.53575/arjicc.u20-v2.2(21)318-330
http://arjicc.com/index.php/arjicc

مطالب القرآن: تعارف و تجزیہ

Maṭālib al-Qurʾān: An Introduction and Analysis

Prof. Dr, Humayun Abbas [*]

Abstract

The history of Ulūm al-Qurʾān reveals something far greater than the unfolding of a mere intellectual discipline. It discloses the longing of a whole civilization, a caravan of centuries journeying ceaselessly through the illumination of Qurʾān, never halting nor exhausted. In the age of the Companions (may Allah be pleased with them) this knowledge passed from one generation to other like a sacred trust, where the purpose was less the exposition of words than the cultivation of souls. Then, as the great tree of Islamic civilization extended its branches across the horizons of human thoughts, its boughs grew heavy with the blossoms of Fiqhī, Kalāmī, Adabī and Ishārī Tafāsīr. In every age, the great Mufassirīn (exegetes) read the thirst of their times and drew from the wellspring of Quranic wisdom precisely that water which could slake the spirit of their era. Thus, the tradition of tafsīr never settled into a still and stagnant pool, it remained a flowing river, gathering with each new valley it traversed a deeper life, a richer resonance, a fuller meaning, and at every bend of its course leaving behind a sign for those who followed, pointing toward a horizon yet unseen.

It is from this boundless river that Tafsīr: Maṭālib al-Qurʾān by Dr. Ḥabib Allah Chishti, rises as one of its most luminous waves, emerging upon the horizon of contemporary tafasīr (exegesis) as a star appears after a long night, radiant with its full and unhurried light. The most distinguished quality of this work is that its author has gazed upon the Qurʾān as one gaze upon a garden, where every blossom, though singular in its form, is nourished by the same breeze and watered by the same spring. The connection of Āyah to Āyah, the coherence of Sūrah to Sūrah, and the unbroken continuity of meaning that shimmers from beginning to end like pearls threaded upon a single cord, it is precisely this quality of vision that has set this tafsīr apart within the landscape of contemporary Quranic literature. Through its sustained attention to Naẓm-i Qurʾān, this work has unveiled the inner unity of the Qurʾān as a master craftsman unveils a work of intricate art, making those who behold it understand, with sudden and serene certainty, that these lines were never scattered, they were always a single image, awaiting only the eye trained enough to see them whole. Moreover, Imdād al-Karam and Maṭālib al-Qurʾān are themselves additions/ elaborations and extensions of Ziāʾ al-Qurʾān.

Keywords: Contemporary Tafasīr, Maṭālib Al-Qurʾān, Naẓm-I Qurʾān, Peer Muhammad Karam Shah, Dr. Humayun Abbas

قرآن انسانیت کے نام رب العالمین کا پیغام آخریں ہے۔اس کے مطالب کو ہر دور میں عام فہم اسلوب میں انسانوں تک پہنچانے کی تگ ودو کے نتیجہ میں علم تفسیر وجود میں آیا۔انسان کے جتنے علمی، فکری، ذوق ہو سکتے ہیں اتنی ہی تفسیری روشیں سامنے آئیں۔کج فکری بھی ایک روش ہے جب انسان نور وحی سے اکتساب کی بجائے اپنی عقل کو مدار کل مان لیتاہے توانحرافی رویے بھی سامنے آئے۔اس لئے انحرافی روش تفسیر بھی تفسیری ادب میں سامنے آئی۔ تفسیر کی قسموں کو بالرائے اور بالماثور تک محدود کیا گیا مگر یہ تو مناہج واسالیب تھے۔ تفسیر کی قسمیں تو

[*] Dean Faculty of Islamic and Oriental Learning, Government College University, Faisalabad.
Email: drhumayunabbas@gcuf.edu.pk

علمی و فکری، ضخامت، مخاطبین کے اعتبار سے ہونی چاہیے تھیں مگر انہیں صرف منہج واسلوب کی بنیاد پر بالرائے اور بالماثور میں تقسیم کر دیا گیا۔ علمی اعتبار سے تفسیر کو تفسیر لغوی، تفسیر ترتیبی، تفسیر موضوعی میں تقسیم کر سکتے ہیں۔[1] یہ تینوں قسمیں اپنے اسلوب کے اعتبار سے بالماثور اور بالرائے ہونے کا احتمال رکھتی ہیں۔اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ ''بالرائے''میں صرف آراء ہی نہیں ہوتیں ''آثار'' بھی ہوتے ہیں آیات، آثار اور آراء کی روشنی میں تفسیر کی جاتی ہے۔

دنیا کی دیگر تمام زبانوں کی طرح اردو زبان کا تفسیری ادب بھی ثروت مند ہے۔ مکمل، نامکمل، جزوی، ضخیم اور مختصر، تحقیقی اور مناظرانہ، دعوتی اور سیاسی، ادبی و عوامی، ہر طرح کی تفسیر سے اردو زبان مالا مال ہے۔ حال ہی میں اردو زبان میں شائع ہونے والی تفسیر ''مطالب القرآن''، تفسیری ادب میں ایک وقیع اضافہ ہے۔ مفسر ڈاکٹر حبیب اللہ چشتی، فیڈرل کالج اسلام آباد میں بطور ایسوسی ایٹ پروفیسر کام کر رہے ہیں۔ڈاکٹر چشتی دارالعلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ کے فاضلین میں سے ہیں۔ان کی تصانیف کی ایک طویل فہرست ہے۔چند کے نام درج ذیل ہیں:

i. دلائل توحید
ii. فکر اسلامی
iii. اسلام کیا ہے؟
iv. آئیں! قرآن سمجھیں
v. اسلامی اسلوب دعوت
vi. حکمت قرآن
vii. قرآن اور فلسفہ زندگی
viii. قرآن، یہود اور ہم
ix. معارف درود و سلام
x. مقامات رسالت
xi. اثبات میلاد
xii. فقہ حنفی اور حدیث
xiii. جبر و قدر
xiv. تسہیل اخلاق صابری فی عرفان باری
xv. مناسبات قرآن کریم اور تفسیر نظم الدرر (پی ایچ ڈی مقالہ)
xvi. اسلامی عقائد
xvii. حکمت اسلام
xviii. سیرت النبی ﷺ کا عملی پہلو
xix. عقیدہ ختم نبوت (دلائل و مسائل)
xx. توہین رسالت کی سزا
xxi. سیدہ فاطمۃ الزہرا فضائل و خصائل
xxii. شبیر ویزید
xxiii. تعلیمات شاہ جیلاں
xxiv. آبروئے اقبال
xxv. باتیں ضیاء الامت کی
xxvi. امت مسلمہ کا عروج و زوال (اسباب، وجوہات و تدارک)
xxvii. اتحاد امت کیسے ممکن ہے؟
xxviii. روح عبادت
xxix. دانش کدہ
xxx. حضرت ضیاء الامت پر کیے گئے اعتراضات کا علمی جائزہ
xxxi. سیرت نبوی ﷺ اور مسائل حیات

[1]. Dr. Riffat Awais, Dr. Humayun Abbas, A Study of Nafahāt -e-Tafsīr by Dr. Muhammad Ishaq Qureshi, Al-Qamar Research Journal, V:8(4), 2025

ان کی تصانیف کے موضوعات عموماً اصلاحی اور اُسلوبِ بیان نہایت ہی رواں، شستہ، سہل اور عام فہم ہے۔ شعری ذوق بہت عمدہ ہے اس لئے ان کی تمام تصانیف میں اردو، عربی اور فارسی اشعار بکثرت موجود ہیں۔

تفسیر مطالب القرآن چار جلدوں میں تقریباً چار سال کے عرصہ میں مکمل ہوئی۔ یہ 2985 صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر جلد کے آخر پر مفسر نے مصادر و مراجع کی فہرست دی ہوئی ہے۔ اس فہرست سے ظاہر ہوتا ہے کہ فاضل مفسر نے ہر فن اور ہر مکتب فکر کے دستیاب مصادر سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ یہاں تک کہ معاصر مفسرین کی آراء کو بھی نقل کیا ہے جیسے تدبر قرآن، تبیان القرآن اور دیگر۔ جس جگہ ضیاء القرآن کا حوالہ دیا ہے وہاں ڈاکٹر چشتی کی اپنے استاد سے والہانہ عقیدت اور محبت صاف نظر آتی ہے۔ جن دو تفاسیر کو مصنف نے خصوصیت کے ساتھ پیش نظر رکھا وہ تفسیر مظہری اور روح المعانی ہیں۔ یہ دونوں تفاسیر، مظہر جان جاناں کے صوفی مکتب کی نمائندہ ہیں۔ مظہری اور روح المعانی سے بکثرت استفادہ ان کے ''چشتی'' ہونے کا لازمی نتیجہ تھا کیوں کہ جو علم صوفی کے قلب سے گزر کر آتا ہے وہ عجز وانکساری میں گندھا ہوا ضرور ہوتا ہے مگر اس علم کی بنیادیں ''اصلھا ثابت'' کی مظہر اور ایسے علم کی وسعتیں ''وفرعھا فی السماء'' کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔

اس تفسیر کے چند امتیازات درج ذیل ہیں:

مباحثِ علوم القرآن:

کتاب کے مقدمہ میں مصنف نے علوم القرآن کے بعض بنیادی مباحث اور اپنے اسلوب تفسیر کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ اس میں ایک بحث ''فہم قرآن کی کلیدی شرائط'' ہے۔ تیسری شرط ''مثبت سوچ'' تحریر کی ہے۔ اس میں یہ جملے آج کے اعتبار سے اہم ہیں:

''قرآن کریم کوئی گروہی کتاب نہیں یہ آفاقی کتاب ہے۔ اس کا فہم بھی اسی آفاقیت کا متقاضی ہے۔ جن لوگوں نے اپنی سوچ کو کسی گروہ تک محدود کر لیا اور یہ سوچ لیا کہ فہم قرآن کا سارا رزق اسی گروہ کے پاس ہے وہ اپنے مخصوص حلقہ میں تقدس کے جس لبادے میں بھی رہیں وہ کتاب الٰہی کی وسعتیں سمیٹنے سے محروم رہیں گے۔''[2]

تعلق بالرسول کو اجاگر کرنا:

صاحبِ قرآن سے جڑ کر قرآن فہمی کی راہیں وا ہوتی ہیں۔ قرآن کو سمجھنے کے لئے اس قلب اقدس سے فیضان کا حصول لازمی ہے جس پر یہ نازل ہوا۔ صاحب قرآن کو چھوڑ کر قرآن سمجھنے کی کوشش جس نے بھی کی وہ خائب وخاسر ہوا۔ چشتی صاحب نے اس فکر کو پوری تفسیر میں کسی مرحلہ پر نہیں چھوڑا۔ سورۃ النجم کی ابتدائی آیات کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں:

[2] چشتی، پروفیسر ڈاکٹر حبیب اللہ، تفسیر مطالب القرآن، لاہور: ضیاء القرآن پبلی کیشنز، 2025ء، جلد اول، ص: 28

''یہ جواب قسم ہے کہ حضور ﷺ ہر لحاظ سے حق پر قائم ہیں اور آپ جو کچھ فرماتے ہیں وحی الٰہی ہے کیوں کہ قسم مقسم علیہ پر دلیل ہوتی ہے اس لئے ستاروں کی قسم کئی لحاظ سے حضور ﷺ کی صداقت پر دلیل ہے۔ اس سے ایک مراد تو یہ ہے کہ ستاروں کا نظام حضور ﷺ کی صداقت پر گواہ ہے کہ جب اللہ رات کی ظلمتوں کو کافور کرنے کے لئے ستارے روشن کرتا ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ کفر و شرک کے اندھیرے مٹانے کے لئے آفتاب نبوت کو طلوع نہ کرے اور اسی سے یہ واضح کر دیا گیا کہ جیسے ایک ستارہ اپنے راستے سے ذرہ برابر انحراف نہیں کرتا ایسے ہی حضور ﷺ راہ حق سے ذرہ برابر بھی انحراف نہیں کرتے، ضلال سے مراد ہے کل عدول عن المنھج عمداً کان او سھواً یسیرا کان او کثیرا (مفردات۔ مادہ ضل) حق سے کوئی بھی انحراف وہ عمداً ہو یا سہواً، تھوڑا ہو یا زیادہ، غوٰی سے مراد ہے جھل من اعتقاد فاسد (مفردات۔ مادہ غوی) ایسی گمراہی جو فاسد اعتقاد کی بنیاد پر ہو، ماضل میں عملی گمراہی کی نفی ہے اور غوی میں اعتقادی گمراہی کی نفی ہے، اور کسی کا صاحب وہ ہوتا ہے جو لمبا عرصہ اس کے ساتھ لمبا عرصہ گزارتا ہے، مراد یہ ہے کہ ستاروں کا نظام گواہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ مادی تاریکیاں دور کرنے کے لئے ستاروں کے چراغ جلا دیتا ہے تو وہ روحانی ظلمتیں دور کرنے کے لئے آفتاب نبوت بھی طلوع کرے گا اور آپ کی صداقت پر یہ دلیل کافی ہے کہ آپ اتنا عرصہ تمہارے ساتھ رہے لیکن کفر و شرک سے معمور اور برائیوں سے بھرے ہوئے معاشرے میں رہتے ہوئے نہ آپ میں کوئی عملی گمراہی پائی گئی نہ اعتقادی، ان کی شان تو یہ ہے کہ اپنی خواہش سے بولتے ہی نہیں ان کی تو ہر بات وحی الٰہی ہوتی ہے لَمْ يَتَقَوَّلِ الْقُرْاٰنَ مِنْ تِلْقَآءِ نَفْسِهٖ كَمَا يَتَقَوَّلُ الشُّعَرَآءُ وَ كَذَا كُلُّ مَا يَتَكَلَّمُ لَيْسَ مَنْشَؤُهٗ الْهَوَى النَّفْسَانِيَّةُ بَلْ مُسْتَنَدَ اِلَى الْوَحْيِ جَلِيٍ اَوْ خِفِيٍ (مظہری: 450/6) وہ قرآن اپنے پاس سے نہیں بناتے جیسے شعرا اپنا کلام بناتے ہیں اسی طرح آپ کی کوئی بھی بات نفسانی خواہشات سے نہیں ہوتی بلکہ ہر بات کا منبع وحی ہے وہ خفی ہو یا جلی، واضح رہے کہ اس سے حضور ﷺ کے اجتہاد کی نفی نہیں ہوتی کیوں کہ آپ کا اجتہاد بھی وحی کی بنیاد پر تھا نفسانی خواہشات کی بنیاد پر نہیں تھا كَانَ كَالْوَحْيِ لَا نُطْقًا عَنِ الْهَوٰى (مدارک: 389/3) انبیاء کا اجتہاد وحی کی طرح ہوتا ہے اپنی خواہش سے نہیں۔''[3]

سورۃ العصر کی تفسیر کا یہ اقتباس لائق مطالعہ ہے:

''زمانہ اس چیز کا شاہد ہے کہ جو لوگ حق سے کٹ گئے وہ تباہ و برباد ہو گئے اور جو حق سے وابستہ ہو گئے وہی کامیاب و کامران ٹھہرے، اگر فرعون نے حق سے انحراف کیا تو وہ تباہ و برباد ہو گیا اگرچہ وہ جتنا بھی بڑا بادشاہ تھا اور اس کے مقابلے میں بنی اسرائیل نے حق کو قبول کیا تو وہ جتنے بھی کمزور تھے زمین کے مشرقوں اور مغربوں کے وارث بنا دیئے گئے، یہی حقیقت ہر دور میں ثابت ہوئی اور اس حقیقت کا سب سے بڑا گواہ زمانہ ہے کہ حق سے منحرف ہونے والے ذلیل و رسوا ہوئے اور حق کو قبول کرنے والوں کو دائمی عزتوں کے تاج پہنا دیئے گئے اور یہی حقیقت عہد رسالت مآب ﷺ میں آخری حد تک ثابت ہو گئی کہ حق کو قبول کرنے والے حضرت بلال تو سرمدی عزتوں کے امین

[3]۔ چشتی، پروفیسر ڈاکٹر حبیب اللہ، تفسیر مطالب القرآن، جلد 4، ص: 242-243

ٹھہرے اور سیدنا بلال بن گئے لیکن حق سے منحرف ہونے والے قریشی سردار ابو لہب کا نام گالی بن کر رہ گیا، ایمان لا کر غلام زمانے کے امام بن گئے اور حق سے منحرف ہونے والے سردار داستان عبرت اور قصہ پارینہ بن کے رہ گئے اور اس سورہ مبارکہ کا سبب نزول بھی اسی حقیقت کو واضح کرتا ہے، یہ سورہ مبارکہ اس وقت نازل ہوئی جب ایک مشرک سردار کلدہ بن اسید نے حضرت ابو بکر صدیق سے کہا کہ آپ تو تجارت میں بڑی ہوشمندی اور عقل سے کام لیتے تھے اب آپ کو کیا ہو گیا کہ اپنا اتنا بڑا نقصان کر لیا اور اپنے آباء واجداد کا دین چھوڑ کر لات و عزیٰ کی شفاعت سے محروم ہو گئے تو اس پر آپ نے فرمایا جو حق کو قبول کرے اور اچھے کام کرے وہ کبھی نقصان نہیں اٹھاتا تو یہ سورہ مبارکہ سیدنا صدیق اکبر کی تائید میں نازل ہوئی (تفسیر عزیزی:533/4)۔''[4]

سورۃ الکوثر کا یہ جملہ ہر وقت یاد رکھنا چاہیے:

''خیر اسی کو ملے گی جو حضور اکرم ﷺ سے مخلص ہو گا''۔[5]

علامہ آلوسی کے حوالہ سے سورۃ النساء میں لکھا:

مَا مِنْ ذَرَّةِ نُوْرٍ شَعَتْ فِي الْعَالَمِيْنَ اِلَّا تَصَدَّقَتْ بِهَا شَمْسُ ذَاتِهِ ﷺ (روح المعانی:18/6)۔کائنات میں نور کی کوئی کرن جہاں بھی چمک رہی ہو تو وہ آفتاب محمدی ﷺ کا صدقہ ہے۔[6]

اس تفسیر کا انتساب بھی اس حقیقت کو اجاگر کرتا ہے جب تک نبی کریم ﷺ سے جڑیں گے نہیں قرآن کے فیضان سے حصہ نہیں ملے گا۔

اختصارِ مطالب

اس تفسیر میں کتب تفاسیر میں پھیلے ہوئے علمی مباحث کو نقل کرنے کی بجائے مصنف کے نزدیک راجح قول کو نقل کر دیا گیا ہے اس اعتبار سے یہ کتب تفاسیر کے مطالب وعلوم کی عمدہ تسہیل اور تہذیب ہے۔

تفسیرِ لغوی کا اسلوب

مفسر نے مفردات قرآنی کے معانی و مطالب اپنے حواشی میں بیان کرنے کا اہتمام کیا ہے اس کے لئے لغات کے علاوہ تفاسیر کو بھی بطور مصدر استعمال کیا ہے۔چند مثالیں درج ذیل ہیں:

شططا: کا لفظ ''شط'' سے نکلا ہے اور اس کا لفظی معنی ہے دور ہونا۔[7]

[4]۔چشتی، پروفیسر ڈاکٹر حبیب اللہ، تفسیر مطالب القرآن، جلد4، ص:694

[5]۔ایضاً، جلد715/4

[6]۔ایضاً، جلد اول، ص:495

[7]۔ایضاً، جلد2، ص:611

الوتین: مراد ہے رگ دلینَاطُ القَلْبُ وَھوعِرقٌ مُتَّصِلٌ بِہٖ اِذَا انْقَطَعَ مَاتَ صَاحِبُہٗ (جلالین:166/6)[8]

عقیم: بانجھ عورت کو کہا جاتا ہے۔الریح العقیم سے مراد وہ ہوا ہے جس میں کوئی خیر و برکت نہ ہو۔[9]

زلت: استرسال الرجل من غیر قصد (مفردات راغب مادہ زل) بغیر ارادے کے پاؤ پھسل جانا۔[10]

بعض مقامات پر فروق لغویہ کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ضیاء اور نور میں فرق اس طرح واضح کیا:

اَلضِّیَآءُ مَا کَانَ ذَاتِیًا وَ النُّوْرُ مُکْتَسِبًا مِنْ غَیْرِہٖ (صاوی: 78/3)۔[11]

ضیاء اس روشنی کو کہتے ہیں جو ذاتی ہو جب کہ نور اس روشنی کو کہا جاتا ہے جو دوسری چیز سے حاصل کی جائے۔

ایتاء اور اعطاء کا فرق اس طرح واضح کیا:

وَ فِیْ اِسْنَادِ الْاِعْطَاءِ دُوْنَ الْاِیْتَآءِ اِشَارَۃٌ عَلٰی اَنَّ ذٰلِکَ اِیْتَآءٌ عَنْ جِھَۃِ التَّمْلِیْکِ (روح المعانی: 246/30)

اور یہاں ایتاء کے بجائے اعطاء کا لفظ استعمال کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس الکوثر کا مالک بنادیا ہے۔[12]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لغوی اعتبار سے یہ لائق توجہ تفسیر ہے۔

عرفانی رجحان

بعض تفاسیر کلی طور پر عرفانی اسلوب میں لکھی گئی ہیں جیسا امام قشیری کی تفسیر اور بکثرت تفاسیر ایسی ہیں جو جزوی طور پر اپنے اندر عرفانی مباحث سموئے ہوئے ہیں جیسے ''روح المعانی''، ''مظہری''، ''ضیاء القرآن''۔ ''مطالب القرآن'' میں بھی بقدر ضرورت صوفیانہ مباحث کا ذکر موجود ہے۔کیوں نہ ہوتا چشتی صاحب عصر حاضر کے حقیقی صوفی ہیں۔ایک مقام پر فضائل صدیق اکبر کے لئے حضرت مجدد کا حوالہ دیا:

''حضرت مجدد اس تناظر میں فرماتے ہیں:

قَالَ الشَّیْخُ الْاِمَامُ اَبُو الْحَسَن الاَشْعَرِیّ اَنَّ تَفْضِیْلَ اَبِیْ بَکْرٍ ثُمَّ عُمَرَ عَلٰی بَقِیَّۃِ الْاُمَّۃِ قَطْعِیٌّ۔(مکتوبات امام ربانی، دارالمعرفہ129/4، مکتوب نمبر: 266)

شیخ امام ابوالحسن اشعری فرماتے ہیں کہ حضرت ابو بکر اور پھر حضرت عمر کا باقی ساری امت سے افضل ہونا قطعی ہے۔''[13]

اسی طرح حضرت خضر کے بارہ میں مجددی کشف کو بھی ذکر کیا۔[14]

---

[8]۔ایضاً، جلد4، ص:472

[9]۔چشتی، پروفیسر ڈاکٹر حبیب اللہ، تفسیر مطالب القرآن، جلد4، ص:222

[10]۔ایضاً، جلد اول، ص:62

[11]۔ایضاً، جلد2، ص:212

[12]۔ایضاً، جلد4، ص:713

[13]۔چشتی، پروفیسر ڈاکٹر حبیب اللہ، تفسیر مطالب القرآن، جلد4، ص:650

[14]۔ایضاً، جلد2، ص:644

حضرت ابن عربی کے بارہ میں کہاجاتاہے کہ وہ ایمان فرعون کے قائل تھے۔ڈاکٹر چشتی نے شیخ عبد الحق محدث دہلوی،امام شعرانی اور علامہ شبیر احمد عثمانی کا حوالہ دے کر اس نقطۂ نظر کارد کیاہے۔[15] الہام کی عدم حجیت کے لئے روح المعانی کے حوالہ سے امام شعرانی،ابن عربی، مجدد الف ثانی، شیخ عبد القادر جیلانی، جنید بغدادی، سری سقطی، ابو الحسین نوری اور امام غزالی جیسے اکابر صوفیہ کے اسماء گرامی تحریر کئے۔[16] اسی طرح شاہ ولی اللہ کی علمی خدمات سے استفادہ کیا۔شاہ عبد العزیز کی تفسیر سے استفادہ کی مثالیں بھی موجود ہیں۔[17] وللآخرۃ خیر لک من الاولی کی صوفیانہ تفسیر نقل کرتے لکھا:

"قَالَ بَعْضُ اَهْلِ الْاِشَارَاتِ فِی الْاٰیَۃِ اِشَارَۃٌ اِلٰی اَنَّهٗ ﷺ دَائِمًا یَتَرَقّٰی فِی الْکَمَالَاتِ اِلٰی غَیْرِ نِهَایَۃٍفَمَقَامُهٗ فِی الْمُسْتَقْبَلِ اَعْلٰی مِنْهُ فِی الْمَاضِی(صاوی: 291/6)بعض اہل اشارات نے کہاکہ اس آیہ کریمہ میں یہ اشارہ فرمادیا گیاکہ حضور ﷺ ہمیشہ ایسے مقامات کی طرف ترقی فرماتے رہتے تھے جن کی کوئی انتہا نہیں ہے تو مستقبل میں آپ کا مقام ماضی سے بلند وبرتر تھا۔

فَاِنَّهٗ ﷺ لَا یَزَالُ یَتَصَاعَدُ فِی الرِّفْعَۃِ وَ الْکَمَالِ (بیضاوی: /1159)اور حضور کا مقام ہر لمحہ بلند ہوتا رہتا ہے۔

اَلْحَالَۃُ الْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلٰی وَ نِهَایَۃُ اَمْرِکَ خَیْرٌ مِّنْ بِدَایَۃٍ (مظهری: 7/ 426)کہ آپ کی ہر دوسری حالت پہلی حالت سے بہتر ہو گی اور آپ کے ہر کام کا اختتام اس کے آغاز سے بہتر ہو گا۔"[18]

صوفی افکار،صوفی معمولات،کتب تصوف اور تذکرہ صوفیہ کا بکثرت ذکر ڈاکٹر صوفی چشتی کے صوفی ذوق کا مظہر ہے۔

ادبی ذوق

ڈاکٹر چشتی کا شعری ذوق بہت عمدہ ہے۔اکابر شعراء کے فارسی، عربی،اردو کلام کو وہ اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کے لئے بڑی عمدگی سے استعمال کرتے ہیں۔چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

جو قوم کہ فیضان سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات[19]

بندہ عشق شدی ترک نسب کن جامی

[15] ۔ایضاً، جلد 2، ص:259
[16] ۔ایضاً، جلد 2، ص:652
[17] ۔ایضاً، جلد اول، ص:330
[18] ۔ایضاً، جلد 4، ص:653
[19] ۔چشتی، پروفیسر ڈاکٹر حبیب اللہ، تفسیر مطالب القرآن، جلد 3، ص:250

کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست[20]

ہر کہ رمز مصطفی ﷺ فہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دیدہ است[21]

رنج سے خو گر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں[22]

اس تفسیر کے اور بھی امتیازات ہیں جن پر تفصیل سے تقابلی مطالعہ کیا جا سکتا ہے جیسے اسرائیلی روایات کے حوالہ سے خاص اسلوب حضرت موسیٰ کی لکنت کی حقیقت کیا تھی، کیا زبان پر انگارہ رکھا؟[23]

قرآن کریم کے قسمیہ کلمات کی تشریح "کلمات شہادت" کے طور پر کی۔[24] اسی طرح معمولات اہل سنت کی قرآنی وضاحت سنجیدہ، متین اور مکالماتی اسلوب میں کی ہے۔ یہاں بڑے بڑے مفسرین مناظرانہ اسلوب اپنائے بغیر نہ رہ سکے مگر ڈاکٹر چشتی کا یہ کمال خلوص ہے کہ انہوں نے اعتماد دلیل پر کیا، دلیل کو بنیاد بنایا نہ کہ جذبات کو۔[25] معتقدات اہل سنت میں بھی استدلال متین کا یہی رنگ نظر آتا ہے۔[26]

اس تفسیر کی ایک امتیازی خصوصیت آیات و سور کا ربط ہے۔ اس موضوع پر مستقل کتب تحریر کی گئی ہیں۔ حال ہی میں محمد السید ماضی کی کتاب "الربط والتناسب بین آیات القرآن الکریم" کے نام سے آئی ہے۔ گویا متقدمین سے لے کر متأخرین تک ربط، مناسبت، نظم جیسے الفاظ سے ان تعبیر کو ادا کیا گیا۔ مقدمہ میں ڈاکٹر چشتی "مناسبت کا التزام" کے عنوان سے لکھتے ہیں:

قرآن کریم کے فہم صحیح کی بنیادی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ قرآن مجید کی نظم و مناسبت سے کسی حال میں صرف نظر نہ کیا جائے۔ نظم و مناسبت کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن مجید کا ہر جملہ دوسرے جملے سے، ہر آیت دوسری آیت سے اور ہر سورت دوسری سورت سے ایک گہرا ربط اور مناسبت رکھتی ہے۔ کسی بھی کلام کا باہمی ربط اس کا حسن ہوتا ہے تو کلام الٰہی بغیر کسی ربط کے کیسے ہو سکتا ہے؟ حق یہ ہے کہ

---

[20] ۔ایضاً، جلد اول، ص: 128
[21] ۔ایضاً، ص: 336
[22] ۔ایضاً، ص: 338
[23] ۔ایضاً، جلد 2، ص: 704
[24] ۔ایضاً، جلد 4، ص: 661، 683
[25] ۔چشتی، پروفیسر ڈاکٹر حبیب اللہ، تفسیر مطالب القرآن، جلد اول، ص: 146، 210، 599
[26] ۔ایضاً، جلد 2، ص: 663

قرآن مجید کے اسرار و رموز کو جاننے کا ایک مرکزی ذریعہ اس میں پائے جانے والی نظم و مناسبت کا التزام کرنا ہے۔اس شخص پر فہم قرآن کے دروازے کبھی نہیں کھلیں گے جو قرآن مجید میں پائی جانے والی نظم و مناسبت سے صرف نظر کرے گا۔اگر کسی بھی کلام کو اس کے سیاق و سباق سے الگ کر دیا جائے تو اس کا کوئی بھی مفہوم لینے کے بہت سے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔قرآن مجید کو اس کے ربط اور اس کی مناسبت سے الگ کر کے سمجھنے کی کوشش کی جائے گی تو پھر ہر بندہ جو چاہے گا کہنا شروع کر دے گا اور حقیقت کو پردوں کے پیچھے چھپانے کی کوشش کی جائے گی۔ملت اسلامیہ میں پائے جانے والے بہت سے اختلافات کا مرکزی سبب ہی یہی ہے کہ قرآن مجید کو اس کے سیاق و سباق سے ہٹ کر سمجھنے کی کوشش کی گئی اور پھر قرآنی مقصود کو چھوڑتے ہوئے اپنے خود ساختہ نظریات کو قرآن مجید سے ثابت کرنے کا دعوی کر دیا گیا۔[27]

مفسر کے بقول ''نظم، توافق، تناسق اور ربط'' کے الفاظ بھی اسی مفہوم میں استعمال ہوتے ہیں۔[28]

اسی طرح ''مناسبت اور تناسب'' کے الفاظ کو بھی ان میں شامل کیا جاسکتا ہے۔[29] مفتی احمد یار خان نعیمی نے اس ربط کو ''تعلق'' کا نام دیا ہے۔

قدیم مفسرین نے اس ربط کا خیال رکھا اور اس پر بہت کچھ لکھا۔زرکشی، بقاعی، سیوطی، رازی جیسے اساطین علم نے ربط کا ذکر کیا۔برصغیر میں یہ اعزاز شیخ علاء الدین علی بن احمد مہائمی (776ھ-835ھ/1372ء-1431ء) کے حصہ میں آیا۔سید عبدالحئی لکھنوی نے لکھا:

''تفسیریں تو سینکڑوں لکھی جاچکی ہیں مگر جس بات سے ان کی تفسیر کو امتیاز و خصوصیت حاصل ہے وہ یہ ہے کہ اس میں التزام کے ساتھ تمام قرآن پاک کی آیات کریمہ کے باہم دگر مربوط ہونے کو ایسے دل نشین طریقے سے بیان کیا ہے کہ جس کو پڑھ کر انسان وجد میں آجاتا ہے اور بے ساختہ منہ سے داد نکلتی ہے۔''[30]

نظم کی دریافت اتنا بڑا اعزاز سمجھا گیا کہ علامہ مہائمی نے اسے فخر سے بیان کیا:

''یہ نظم قرآن کی باریکیوں میں سے حسین تر، پسندیدہ اور منتخب اشیاء ہیں جو مجھ سے پہلے کوئی انسان یا کوئی جن، ان نکات کے نہ نزدیک ہوا اور نہ قریب پھٹک سکا۔۔۔لیکن اللہ سبحانہ و تعالی نے مجھ پر ان پوشیدہ نکات کو ظاہر کرنے کی خطرناک و ذی قدر تمنا کو پورا کرنے میں آسانیاں بہم پہنچانے پر حد درجہ احسان و کرم فرمایا اور یہ محض اس کے فضل و جود ہیں۔''[31]

اللہ کے احسان کا تذکرہ کرنے کے بعد مہائمی لکھتے ہیں:

''پس قرآن حکیم کا ہر کلمہ یا لفظ اس کتاب عظیم کا شیش محل ہے اور ہر آیت اس کی پڑوسی یعنی آگے پیچھے کی آیتوں یا کتب منزلہ متقدمہ کی

---

[27]۔ایضاً، جلد اول، ص:30

[28]۔چشتی، پروفیسر ڈاکٹر حبیب اللہ، تفسیر مطالب القرآن، جلد اول، ص:20

[29]۔راقم کی نگرانی میں لکھا گیا ذاکر ہاشمی کا مقالہ برائے پی ایچ ڈی بہ عنوان ''سعید نورسی اور سعید حوی کا تصور نظم قرآن: تقابلی جائزہ'' ملاحظہ فرمائیں۔

[30]۔لکھنوی، سید عبدالحئی، یاد ایام، علی گڑھ:1919ء، ص:59

[31]۔مہائمی، علامہ علی بن احمد بن ابراہیم، تبصیر الرحمن و تیسیر المنان بعض مایشیر الی اعجاز القرآن، مترجم: علامہ حبیب البشر خیری، نئی دہلی، جلد اول، ص:151

- سعید نورسی نے اشارات الاعجاز میں مفردات اور آیات کے حوالہ سے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔مگر اس تصور کو البقرۃ کی آیت 33 تک ہی پیش کر سکے۔

برہان و محبت ہے۔اور جن لوگوں نے اس کتاب میں تکرار آیات والفاظ کا گمان کیا ہے یہ ان کی نظروں کا قصور ہے جو کہ وہ کبر و سرکشی کی وجہ سے سمجھنے سے عاجز و قاصر ہیں۔"[32]

ربط کے اس تصور کو ڈاکٹر چشتی نے پوری تفسیر میں نبھانے کی کوشش کی ہے۔انہوں نے ربط کی مختلف شکلوں کا اس تفسیر میں ذکر کیا:

i. باہمی ربط (یہ صرف چند مقامات پر مذکور ہے)
ii. ما قبل ربط (پورے قرآن میں یہ اُسلوب موجود ہے)
iii. پوری سورۃ کا ربط (اس کو صرف سورۂ بقرۃ کے آخر پر ذکر کیا)
iv. فواتح و خواتیم کا ربط (ہر سورت میں یہ اُسلوب ہے)
v. صفات باری تعالیٰ کا ما قبل مضمون سے ربط
vi. قرآن کے اول و آخر کا ربط

گویا یہ تفسیر ربطِ آیات و سور پر مبنی ہے۔ان میں سے چند کی مثالیں درج ذیل ہیں:

قرآن کریم کی بہت ساری آیات کا اختتام صفات باری تعالیٰ پر ہوتا ہے۔کسی صورت میں کبھی ایک صفت یا کبھی دو صفات کا عموماً ذکر آتا ہے۔ ان صفات کا ما قبل مضمون سے گہرا ربط ہوتا ہے۔ڈاکٹر چشتی نے "عموماً ما قبل" ربط کا اہتمام خصوصیت سے کیا،اس میں ما قبل آیت سے ربط کا ذکر ہوتا ہے، مگر صفات کے ما قبل مضمون سے ربط کا بھی کہیں کہیں ذکر کیا ہے۔ان صفات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ما قبل حکم ان صفات کے تحت بیان ہوا ہے۔[33]

سورۃ الفتح کی آیت 4 میں وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا آیا ہے۔اس کے تحت ڈاکٹر چشتی نے لکھا:

"وہ چاہتا تو محض اپنے حکم سے یا کوئی زمینی و آسمانی عذاب بھیج کر بھی ان کافروں کو ختم کر سکتا تھا لیکن اس نے یہ تمام معاملہ اپنے مکمل علم اور حکمت تامہ کی روشنی میں کیا ہے اس لئے تم اس معاملے کو اللہ تعالیٰ کے علم و حکمت کے سپرد کرو اور پھر دیکھتے رہو کہ یہ صلح تمہارے لئے کیسے فتح مبین بنتی ہے۔"[34]

اسی سورہ کی ساتویں آیت میں وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا آیا ہے۔یہاں چشتی صاحب نے لکھا:

---

[32]۔ مہائمی، تبصیر الرحمن وتیسیر المنان بعض مایشیر الی اعجاز القرآن، جلد اول، ص:152

[33]۔ ملاحظہ فرمائیں:

- ڈاکٹر محمد ہمایوں عباس شمس، صفات الٰہی کے بیان کا قرآنی اُسلوب اور انسانی زندگی پر ان کے اثرات، مجلہ تحقیقات اسلامی، علی گڑھ (انڈیا)، جلد 25، شمارہ 2، اپریل تا جون 2006ء

[34]۔ چشتی، پروفیسر ڈاکٹر حبیب اللہ، تفسیر مطالب القرآن، جلد 4، ص:165

''پہلے اس آیت سے مراد مومنوں کی مدد کرنا تھا اس لئے اس کا اختتام اللہ تعالیٰ کی صفات ''عَلِیمًا حَکِیمًا'' سے ہوا اور یہاں اس سے مراد منافقوں کی ذلت پر دلیل دینا ہے اس لئے اس کا اختتام ''عَزِیزًا حَکِیمًا'' سے ہوا ہے، مراد یہ ہے کہ زمین و آسمان کے تمام لشکر حکم الٰہی کے منتظر ہیں وہ منافقوں کو تباہ کرنے پر پوری طرح قادر ہے لیکن وہ اپنی حکمت کے تحت ابھی انہیں تباہ نہیں کر رہا اور سنبھلنے کا موقع دے رہا ہے۔''[35]

سورۃ النساء کی آیت 158 میں وَکَانَ اللّٰہُ عَزِیزًا حَکِیمًا آیا ہے اس کے تحت لکھا:

''آیہ کریمہ کا اختتام اللہ تعالیٰ کے عزیز و حکیم ہونے کے حوالہ سے کیا گیا جو اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ یہود کے تمام ارادے ناکام ہو گئے تھے۔ اگر یہود نے آپ کو سولی پر لٹکایا ہوتا اور وہ سولی لٹکانے اور رسوا کرنے کے قبیح ارادوں میں کامیاب ہو گئے ہوتے تو یہاں عزیز کا حوالہ کبھی نہ دیا جاتا اور حکیم کا ذکر بھی فرمایا کہ اس نے اپنی حکمت سے اپنے پیغمبر کو ان کے شر سے بچا لیا اور یہود کو ہمیشہ کے لیے رسوا کر دیا۔''[36]

اسی طرح اس ربط کی روشنی میں مفسر نے بعض تفسیری اقوال میں ترجیح کے اُسلوب کو بھی اپنایا۔[37]

اگر ڈاکٹر صاحب پورے قرآن کریم میں مذکورہ صفات کے ربط کا بھی ذکر کرتے تو اس اُسلوب میں وہ شاید پہلے مفسر ہوتے۔ قرآن کے اول و آخر ربط پر بھی ڈاکٹر چشتی نے روشنی ڈالی۔ اس حوالہ سے تفسیر کے آخری اقتباس کو پڑھنا چاہیے۔ وہ لکھتے ہیں:

''قرآن کریم کی ابتدا سورۃ الفاتحہ سے ہوئی تھی جس کا مقصود رجوع الی اللہ ہی تھا یعنی انسان کا معبود و مستعان اللہ تعالیٰ ہی ہے اور انسان کو ہر حال میں اس کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور قرآن مجید کا اختتام المعوذ تین سے ہوا جن کا مقصود بھی یہی ہے کہ انسان کو ہر شر سے بچنے کیلئے اللہ تعالی کی طرف ہی رجوع کرنا چاہیے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ تعلیمات قرآنی کا مقصود بندے کو اللہ تعالی سے ملانا ہے۔ سورۃ الفاتحہ میں پہلے انسان پر یہ واضح فرمایا گیا تھا کہ تیرا معبود و مستعان صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے پھر انسان نے اللہ تعالیٰ سے صراط مستقیم پر چلنے کا سوال کیا تا کہ سفر زیست طے کرتے ہوئے وہ کسی ایسے راستے پر نہ چل پڑے جو رجوع الی اللہ کی نزاکتوں کیخلاف ہو تو پورا قرآن مجید اسی صراط مستقیم کا بیان ہے اور آخر میں پھر المعوذ تین میں اسی رجوع الی اللہ کی تلقین فرمادی گئی اس سے قرآن مجید کے فواتح وخواتیم میں ربط بالکل واضح ہو جاتا ہے۔

اسی تناظر میں علامہ آلوسی ایک اور نکتہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اِنَّ اَوَّلَ حُرُوْفِهٖ الْبَاءُ وَ اٰخِرُهَا السِّیْنُ فَكَاَنَّهٗ قِیْلَ بس اَیْ حَسْبُ فَفِیْهِ اِشَارَةٌ اِلٰی اَنَّهٗ كَافٍ عَمَّا سِوَاهُ وَ رَمْز اِلٰی قَوْلِهٖ تَعَالٰی مَا فَرَّطْنَا فِی الْكِتَابِ مِنْ شَیْءٍ وَقَدْ نَظَم ذٰلِكَ بَعْضُ الْفرسِ فَقَالَ

اول وآخر قرآن زچہ باآمد وسین
یعنی اندر دو جہاں رہبر ما قرآن بس
(روح المعانی: 288/30)

---

[35]۔ ایضاً، ص: 166
[36]۔ ایضاً، جلد اول، ص: 491
[37]۔ ایضاً، جلد اول، ص: 155، 523/ جلد 2، ص: 208

کہ قرآن کریم کا پہلا حرف باء ہے اور آخری حرف سین ہے گویا کہ فرمایا گیا کہ بس یعنی قرآن تمہاری رہنمائی کیلئے کافی ہے۔اس میں اشارہ ہے کہ قرآن کریم ہر دوسری چیز سے بے نیاز کر دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں اسی راز سے پردہ اٹھایا گیا ہے ہم نے اس قرآن میں ہر چیز کو بیان کر دیا، اور کسی فارسی شاعر نے اس حقیقت کو اپنے شعر میں اس طرح بیان کیا ہے کہ قرآن کا اول و آخر باء اور سین ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ دونوں جہانوں کی رہنمائی کیلئے ہمارے لئے قرآن بس ہے یعنی دارین کی ہدایت کیلئے ہمارے لئے قرآن کافی ہے اور اس کے مقابلہ میں ہمیں کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہے۔"[38]

نظم قرآن کے بعض مفسرین نے نظم کی آڑ میں احادیث اور شان نزول کی روایات کی اہمیت کا انکار کر دیا مگر مطالب القرآن کے ہر صفحہ پر احادیث اور شان نزول کی روایات موجود ہیں۔

قاری کسی دوسرے کے عملی کام کو اپنی آنکھ سے دیکھتا ہے ظاہر ہے لکھنے والے کے اپنے مقاصد واہداف ہوتے اور پڑھنے والے کا اپنا نقطۂ نظر، اس حوالہ سے چند گذارشات درج ذیل ہیں:

i. معوذتین کے قرآن ہونے یا نہ ہونے پر حضرت عبداللہ بن مسعود سے منسوب اقوال کا تذکرہ مفسرین نے کیا۔ ڈاکٹر چشتی نے حضرت عبداللہ کے ایک اور قول کو نقل کر کے یہ تاثر دیا کہ ایک دوسرے قول میں وہ ان سورتوں کی فضیلت بیان کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

اور حضرت ابن مسعود تو خود ان سورتوں کے راوی ہیں۔ امام طبرانی روایت کرتے ہیں: عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالِ لَقَدْ أُنْزِلَ عَلَيَّ اٰيَاتٌ لَمْ يُنَزَّلْ عَلَيَّ مِثْلُهُنَّ اَلْمُعَوَّذَتَيْنِ (المعجم الأوسط للطبرانی، 116/3، دار الحرمین، قاہرہ: رقم الحدیث: 2658) حضرت ابن مسعود فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ مجھ پر ایسی آیات نازل ہوئی ہیں کہ ان کی مثل پہلے نہیں اتریں اور وہ معوذتین ہیں۔[39] اس روایت کو ضیاء القرآن میں بھی نقل کیا گیا ہے مگر وہاں حوالہ علامہ سیوطی کی الدر المنثور کا ہے۔ اخرج الطبرانی فی الأوسط بسند حسن۔۔۔(الدر المنثور، جلد5، ص: 721)۔ دلچسپ چیز یہ ہے کہ طبرانی نے جس روایت کو نقل کیا وہ ابن مسعود کی نہیں ابو مسعود کی ہے اور یہ دو علیحدہ علیحدہ صحابہ ہیں۔ عقلی طور پر بھی دیکھا جائے تو اگر یہ روایت ابن مسعود کی ہوتی تو اس مسئلہ پر اس قدر لکھا نہ جاتا یہ روایت نقل کر کے قصہ نبٹا دیا جاتا۔ حضرت ابن مسعود سے اس قول کا منسوب نہ ہونا ہی اصل حل ہے اور چشتی صاحب نے بھی اس کو نقل بھی کیا مگر اس روایت سے استدلال درست نہیں۔

ii. دور حاضر میں ثانوی مصادر سے نقل کو بہ نظر استحسان نہیں دیکھا جاتا۔ مطالب القرآن میں احادیث کے لئے ابن کثیر، شان نزول

---

[38]۔ چشتی، پروفیسر ڈاکٹر حبیب اللہ، تفسیر مطالب القرآن، جلد4، ص:742-743

[39]۔ ایضاً، جلد4، ص:737

کے لئے تفسیر عزیزی، لغت کے لئے المنجد کا حوالہ مناسب نہیں۔[40] بعض مقامات پر حوالہ رہ گیا۔[41] اسی طرح کتب احادیث کے حوالوں کا اُسلوب یکساں نہیں۔[42]

iii. بعض مقامات پر کسی قول کو ترجیح نہ دینا تشکیک پیدا کرتا ہے۔ حضرت یعقوب کی بینائی جانے پر امام رازی کے اقوال نقل کر دیئے بعد میں کہا کہ صاوی کے نزدیک اقرب یہ کہ بینائی پوری نہ گئی تھی مگر اپنا نقطۂ نظر بیان نہ کیا۔[43] شاید مفسر کے ذہن میں یہ تھا کہ یہ شاید فصبر جمیل (یوسف:18) کے منافی ہے مگر اس مقام پر ان کے استاد گرامی مرتبت نے ضیاء القرآن میں روح المعانی اور مظہری کے حوالہ سے جو لکھالائق مطالعہ ہے۔[44]

یہاں فاضل مفسر سے ایک اور تسامح ہوا کہ وہ امام رازی کی عبارت کا ترجمہ کرتے ہوئے ''اور حضرت یعقوب پر غلبہ بکا کی وجہ سے'' کی بجائے ''اور حضرت یوسف پر غلبہ بکا کی وجہ سے'' تحریر کر گئے۔[45] غالباً پروف خوانی میں عدم توجہ کی وجہ سے یہ ہو گیا۔

iv. فاضل مفسر نے قدیم، جدید اور معاصر مفسرین سے استفادہ کیا۔ ترجمہ میں بہتری، عمدہ تعبیرات کی گنجائش ہوتی ہے، فبای الاء ربکما تکذبن میں اُلاء کا ترجمہ نعمت کیا جاتا ہے۔ اس لفظ کے دوسرے معانی فاضل مفسر کے ذہن میں تھے اس لئے "يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَّ نُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ۔ فبای الاء ربکما تکذبن "[46] کے حواشی میں لکھا: ''اگر یہاں اُلآء کا لفظ نعمتوں کے معنی میں بھی ہو تو تب بھی اس میں کوئی اشکال نہیں۔۔۔''[47]۔ یہاں امین احسن اصلاحی یا فراہی مکتب فکر نے اس کو کیا سمجھا کی بجائے ایک صوفی مفسر علامہ عبد القدیر حسرت صدیقی قادری کی ''تفسیر صدیقی'' سے چند اقتباسات نقل کرنا مناسب ہے۔ آیت 13 کے حاشیہ میں وہ لکھتے ہیں: اٰلآء کو تمام تفاسیر میں نعمت کے معنی میں لیا ہے مگر مجھے آثار قدرت، عظمت کے معنی مناسب معلوم ہوتے ہیں کیوں کہ آگے چل کر بعض جگہ نعمت کے معنی لینے میں بڑی تاویل کرنا پڑتی ہے''۔ اور پھر اس آیت کریمہ کا ترجمہ یوں کیا: ''پھر تم اے جن وانس خدا کے کن آثار قدرت وعظمت کا انکار کر سکتے ہو''۔[48]

---

[40]۔ چشتی، پروفیسر ڈاکٹر حبیب اللہ، تفسیر مطالب القرآن، جلد اول، ص:176، 184، 218، 226، 240، 267/ جلد4، ص:658

[41]۔ ایضاً، جلد اول، ص:86، 201، 210، 231، 712، 582

[42]۔ ایضاً، جلد2، ص:430، 441، 622

[43]۔ ایضاً، جلد2، ص:379، 374

[44]۔ الازہری، محمد کرم شاہ، ضیاء القرآن، لاہور: ضیاء القرآن پبلی کیشنز، 1400ھ، جلد2، ص:450-451

[45]۔ چشتی، پروفیسر ڈاکٹر حبیب اللہ، تفسیر مطالب القرآن، جلد2، ص:379

[46]۔ الرحمن:35-36

[47]۔ چشتی، پروفیسر ڈاکٹر حبیب اللہ، تفسیر مطالب القرآن، جلد4، ص:278

[48]۔ حسرت، عبدالقدیر صدیقی، تفسیر صدیقی، کراچی: ادارہ تفسیر صدیقی، 2000ء، جلد6، ص:3327

یمعشر الجن والانس[49] کے بعد جب یہ آیت آئی تو یہ ترجمہ کیا: ''پھر تم اپنے رب کے کن کن کرشمہ ہائے قدرت کی تکذیب کروگے''۔[50] اور ساتھ لکھا اے اہل علم! ذرا غور کرکے بتایئے کہ یہاں اٰلآءِ کے معنی عظمت و قوت کے مناسب ہیں یا نعمت کے؟[51]

البتہ آیت 46 وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ کے بعد ترجمہ ''پھر تم اپنے رب کی کس کس نعمت سے انکار کروگے'' ہی کیا ہے۔ سورۃ الاعراف آیت 49 میں لکھا ہے اٰلآءِ کے دو معنی ہیں ایک احسان اور دوسرا قدرت اور پھر اس آیت میں ''احسان'' سے ترجمہ کیا۔[52] سورۃ النجم آیت 55 میں لکھا ''اٰلآءِ کے معنی نعمت کے بھی ہیں اور آثار قدرت کے بھی، یہاں آثار قدرت کے معنی زیادہ چسپاں ہیں''۔[53]

اٰلآءِ کا معنی نعمت درست مگر جب مفسر ربط کی بات کرے، اور ربط کا تقاضا ہو کہ آیات کے سیاق و سباق کے مطابق دوسرے معنی کی گنجائش ہو تو یہ علمی استفادہ نہ کرنا مناسب نہیں لگا۔[54]

قاضی ثناءاللہ پانی پتی کی تفسیر سے فاضل مفسر کا استفادہ ظاہر ہے وہ آیت 45 کے تحت لکھتے ہیں کہ آیت ''کل من علیھا فان'' سے اس آیت تک تنبیہات، توبیخات، زجریات اور عذاب کی دھمکیاں ہیں یہ تمام چیزیں اللہ کی نعمتیں ہیں کیوں کہ گناہوں سے باز رہنے کا ذریعہ ہیں علماء کا یہ قول محض تکلف ہے۔[55]

v. دو ترجموں نے ترجمہ کی اہمیت وافادیت کو ختم کردیا ہے۔ جب مفسر کا ہدف عام قاری ہے جو قرآن کے مطالب سے آگاہی چاہتا ہے تو اسے صرف وہ ترجمہ پڑھنے کے لئے دیا جائے جو عام فہم، سہل اور مقصود تک پہنچانے والا ہو۔

vi. آیات کے ربط ایک سے زائد ہو سکتے ہیں جیسا کہ تفسیر نعیمی میں مذکور ہیں۔ نظم کے عصری مفسرین نے کم از کم اُصول و قواعد ضرور وضع کرلئے ہیں، اسی طرح ربط کی تلاش کے قواعد بھی کئے جاسکتے ہیں۔

vii. سورۃ التین کے پہلے حاشیہ میں لکھا: ''ان آیات میں تین قسمیں کھائی گئی ہیں''۔[56] تفسیر ضیاء القرآن میں اس سورۃ کا آغاز ان

---

[49]۔ الرحمن: 33

[50]۔ حسرت، تفسیر صدیقی، جلد 6، ص: 3333

[51]۔ ایضاً، جلد 6، ص: 3333

[52]۔ ایضاً، جلد 2، ص: 1143

[53]۔ ایضاً، جلد 6، ص: 3305

[54]۔ اشتیاق احمد ظلی نے ''قرآنی مقالات'' کے عنوان سے مضامین جمع کئے جو ادارہ علوم القرآن، علی گڑھ سے شائع ہوئے ان میں مولانا بدرالدین اصلاحی کا مضمون ص: 121-128 ملاحظہ فرمائیں۔

[55]۔ المظہری، قاضی محمد ثناءاللہ، تفسیر المظہری، تحقیق: احمد عزو عنایۃ، بیروت: داراحیاء التراث الاعربی، 2004ء، جلد 9، ص: 134

[56]۔ چشتی، پروفیسر ڈاکٹر حبیب اللہ، تفسیر مطالب القرآن، جلد 4، ص: 661

جملوں سے ہوتا ہے: ''اس سورۃ کا افتتاح چار چیزوں کی قسمیں کھا کر کیا جارہا ہے''۔[57]

اور وہ چار چیزیں ''تین''، ''زیتون''، ''طور سینا'' اور ''بلد امین'' ہیں۔

viii. اسی طرح فہارس مضامین ہر جلد کے آخر میں دی گئی ہیں وہاں سورت کا نام اور حاشیہ نمبر تو درج ہے مگر صفحہ نمبر نہیں ہے۔ صفحات کی فہرست ابتدا میں دی گئی ہے ان فہارس کا مقصد قاری کی آسانی ہوتا ہے اس اُسلوب سے قاری کو آسانی نہیں رہتی یہ اگر ''امداد الکرم'' کے اُسلوب پر مرتب ہوتیں تو استفادہ آسان تھا۔

ix. فہرست مصادر و مراجع میں تفاسیر کے نام اس طرح لکھے: ''تفسیر تدبر قرآن''، ''تفسیر تفہیم القرآن''، ''تفسیر تبیان القرآن''، حالانکہ کسی کے ٹائٹل پر اس طرح نہیں لکھا گیا۔ ضیاء القرآن کے پشتہ پر تفسیر لکھا ہے مگر سامنے ٹائٹل بغیر ''تفسیر'' لفظ کے ہے۔ اسی اُسلوب پر تفسیر کا نام ''مطالب القرآن'' ہونا چاہیے تھا نہ کہ ''تفسیر مطالب القرآن''۔ اور خود مفسر نے اس تفسیر کو ہر جگہ حواشی سے تعبیر کیا ہے۔[58]

کہا جاسکتا ہے کہ تفسیری ادب میں مطالب القرآن علمی، ادبی و فکری اعتبار سے ایک وقیع اضافہ ہے۔ ایک نکتہ ضرور ہمیں پیش نظر رکھنا چاہیے کہ جو ادب آج تخلیق ہو رہا ہے وہ ''Gen Z, Gen α'' کے زیر مطالعہ آنا ہے۔ کیا علوم دینیہ سے منسلک افراد نے اس نسل کی ''مستقیم فکری'' کے زاویہ نگاہ اور اس نسل کی ذہنی اپج کے مطابق ادب تخلیق کیا؟ یہ نہ ہو کہ ہم پرانے اسلوب کو ترک نہ کریں اور یہ جنریشن اس سے اخذ نہ کرے جس سے تشکیک بڑھے گی۔

---

[57]۔ الازہری، ضیاء القرآن، جلد 5، ص: 605

[58]۔ چشتی، پروفیسر ڈاکٹر حبیب اللہ، تفسیر مطالب القرآن، مطالب القرآن، جلد 3، ص: 97، 135، 181، 214، 263، 306، 359